یعقوب شاہ

سُود کے متعلق چند سوالات

اہلِ اسلام کے لئے عرصۂ دراز سے جو مسائل انتہائی پیچیدگی کا سبب بنے ہوئے ہیں ان میں ایک مسئلہ کمرشل انٹرسٹ یعنی تجارتی سود کا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ مفتیان کرام فن اقتصادیات میں کورے ہوتے ہیں اور ماہرین اقتصادیات تعلیمات دین سے بے بہرہ۔ اس لئے مسئلے کا صحیح حل نہیں ہو پاتا۔ محترم یعقوب شاہ صاحب سابق آڈیٹر جنرل پاکستان جس قدر ماہر اقتصادیات ہیں اسی قدر دینی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ یہی بے چینی اور خلش ہے جو گویا سوالنامے کی شکل میں پیش ہو رہی ہے۔ جو حضرات سنجیدہ اظہارِ خیال فرمائیں ان کے لئے "ثقافت" کے صفحات حاضر ہیں۔

مندرجۂ ذیل سطور کے تحریر کرنے پر مجھے جس چیز نے مجبور کیا ہے وہ یہ ہے کہ میرا عمر بھر کا اثاثہ پراویڈنٹ فنڈ کی صورت میں تھا اور اس میں ایک کثیر رقم سود کی شامل تھی۔ مجھے ابھی تک اس کا تسلی بخش جواب نہیں مل سکا کہ آیا یہ رقم میرے لئے جائز ہے یا ممنوع۔ جن علمائے کرام سے میں نے رجوع کیا ان میں سے اکثر نے اسے حرام کہا۔ لیکن ان میں سے دو نے جن کا مجھے بڑا احترام ہے اس کو جائز قرار دیا۔ ایک صاحب نے لکھ کر اور دوسرے صاحب نے زبانی۔ اس لئے میں نے اس مسئلہ کے متعلق اردو اور انگریزی میں لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ لیکن جو کتابیں میری نظر سے گذریں ان سے میری تشفی نہیں ہوئی۔ فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ آیا ہر قسم کا سود جو آج کل رائج ہے "ربا" کے تحت آتا ہے اور اس لئے قرآنی احکام کے مطابق حرام ہے یا اس کی کچھ ایسی صورتیں بھی ہیں جن پر "ربا" کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور جن سے مسلمان بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ باوجود کافی تگ و دو کے میں اس سوال کا تسلی بخش جواب دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ موجودہ سعی بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ اس کوشش میں جو میرے ہاتھ آیا آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اور آپ سے اور خاص کر علمائے کرام سے ہدایت کا طالب ہوں۔ تاکہ صحیح نتیجہ پر پہنچ سکوں۔

(۳) قرآن مجید میں "ربوا" کا ذکر ان چار مواقع پر آیا ہے:

(الف) سورۂ روم: وما اتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ۔

(ب) سورۂ نساء: واخذھم الربوا وقد نھوا عنہ واکلھم اموال الناس بالباطل۔

(ج) سورۂ آل عمران: یا ایھا الذین اٰمنوا لا تاکلوا الربوا اضعافاً مضاعفہ واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔

(د) سورۂ بقر: الذین یاکلون الربوا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطن من المس، ذالک بانھم قالوا انما البیع مثل الربوا، واحل اللہ البیع وحرم الربوا، فمن جاءہ موعظۃ

من ربہ فانتھی فلہ ما سلف وامرہ الی اللہ ومن عاد فاولئک اصحاب النار فیھا خالدون، یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات واللہ لایحب کل کفار اثیم، یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مؤمنین، فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ، وان تبتم فلکم رؤس اموالکم، لا تظلمون ولا تظلمون۔

(۳) مولوی اصغر علی روحی فرماتے ہیں:

"معتبر اور مقبول مفسرین نے پہلی آیت (سورۂ روم) کی تاویل ایسے معانی سے کی ہے جن کی رو سے وہ ہماری بحث میں داخل نہیں ہو سکتی۔ اس کی تاویل عطیہ سے کی ہے۔ جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کو دیتے ہیں اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ معاوضہ ملے۔ یہ تفسیر ابن عباس، سعید بن جبیر، مجاہد، طاؤس، قتادہ اور ضحاک نے کی ہے۔ اور شیخ المفسرین طبری نے ان سے نقل کی ہے۔ نیز یہ آیت مکیہ ہے اور قرآن کا جو حصہ مکہ شریف میں نازل ہوا اس میں جزئی احکام نازل نہیں ہوئے بلکہ اس میں صرف توحید اور آخرت کا ذکر اور بڑے بڑے مکارم اخلاق کا بیان ہے۔ تشریح جزئیات مدینہ منورہ کی آیات میں ہے۔ جیسا کہ امام شاطبی نے موافقات میں ظاہر کیا ہے۔ سورۂ نساء والی آیت تاریخی ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا ذکر کیا ہے جس پر سود حرام کیا گیا تھا مگر وہ سود سے باز نہ آئی۔۔۔۔ سورہ آل عمران اور سورہ بقرہ دونوں کی آیتوں میں "ربوا" کا لفظ الف لام کے ساتھ ہے۔۔۔۔ اس لئے "الربوا" سے وہ "ربوا" مراد لیا جائے گا جو مخاطبین کے نزدیک معہود ہے یعنی جسے مخاطبین جانتے ہیں اور جو عام طور پر لوگوں میں متداول ہے پس اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ لفظ "الربوا" سے وہ "ربوا" مراد ہے جو اہل عرب کے ہاں متداول تھا۔"

(۴) مولانا مودودی صاحب[۲] نے لکھا ہے:

"قرآن جس زیادتی کو حرام قرار دیتا ہے وہ ایک خاص قسم کی زیادتی ہے۔ اس لئے اس کو "الربوا" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اہل عرب کی زبان میں اسلام سے پہلے بھی معاملہ کی اس خاص نوعیت کو اسی اصطلاحی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔۔۔۔ چونکہ "الربوا" ایک خاص قسم کی زیادتی کا نام تھا اور وہ معلوم و مشہور تھی۔ اس لئے قرآن مجید میں اس کی کوئی تشریح نہیں کی گئی۔"

(۵) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

"ان اٰخر ما نزلت اٰیۃ الربوا وان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قبض ولم یفسرھا لنا

---

[۱] ما فی الاسلام - جلد ثانی صفحہ ۳۶۴

[۲] سود - حصہ اول - صفحہ ۳۴ و ۳۵

فدعوا الربوا والریبۃ"۔

یعنی آیت "ربوا" (قرآن مجید کی) آخری آیات میں سے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تشریح فرمانے سے پہلے رحلت فرما گئے۔ پس ربوا اور ریبہ (جس میں "ربوا" کا شائبہ ہو) دونوں کو چھوڑ دو۔

(۶) مندرجہ بالا اقتباسات سے عیاں ہے کہ (ا) الربوا ایک خاص قسم کی زیادتی کا نام ہے جس کی تشریح نہ قرآن مجید میں موجود ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اور (ب) "الربوا" سے مراد وہ خاص قسم کی زیادتی ہے جو اس زمانہ میں عربوں میں اس نام سے معلوم و مشہور تھی۔ چنانچہ یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ہم یہ دریافت کریں کہ اُس وقت کے عرب کس قسم کی زیادتی یا بڑھوتری کو "الربوا" کے اصطلاحی نام سے یاد کرتے تھے۔ تاکہ اس کے متعلق غلطی کی وجہ سے ہم معصیت کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ حلال و حرام کے معاملہ میں جہاں غیر ضروری آسانی پسندیدہ نہیں، وہاں بے جا سختی بھی منع ہے۔ جہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ممنوع چیزوں کو جائز نہ ٹھہرایا جائے، اس کو ممنوع قرار نہ دیکھا جائے۔

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب فرماتے ہیں:

"قرآن مجید میں جب یہ آیت اُتری "اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا" یعنی ان لوگوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنا لیا ہے۔ تو حضرت عدی نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے آنحضرت صلعم سے عرض کی کہ ہم اپنے پیشوایانِ مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں۔ عرض کی کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا یہی رب بنانا ہے عموماً اہلِ مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقل سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے۔ شریعت کی تاسیس حلال و حرام کی تعیین، جائز و ناجائز کی تفریق، امر و نہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں پیغمبر صرف مبلغ اور پیغام رساں اور تعلیم الٰہی سے ان احکام کے شارع اور بیان کرنے والے ہیں اس بناء پر قرآن مجید میں ذاتِ نبوی کی صفت رسالت کو بار بار تاکیداً اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔"[۱] جہاں ہمارے بزرگانِ دین نے اپنے تقوے کے سبب یا سزا کی سختی کے پیشِ نظر سود کے معاملہ میں کبھی ڈھیل نہیں دی، وہاں اُنہوں نے اس کے معنی کی وسعت کے متعلق شاید اسی قدر احتیاط استعمال نہیں فرمائی اور "ربوا" اور "سود" کو متبادل الفاظ سمجھ لیا ہے۔ اس طرح ممکن ہے ہم نے سود کی ایسی صورتیں حرام قرار دے دی ہوں جن کا جاہلیت کے عربوں میں رواج نہ تھا۔ جن پر ان دنوں لفظ "ربوا" کا اطلاق نہ ہوتا تھا۔ اور جن میں اُس زمانہ کی مروجہ صورتوں کی خرابیاں بھی موجود نہیں ہیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا ہے تو ہمیں سوچنا چاہیئے کہ کیا اس طرح ہم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کر سکیں گے؟

---

[۱] سیرۃ النبی جلد چہارم صفحہ ۴۲۹۔

(۷) گو صحاح میں کوئی ایسی حدیث نہیں ملتی جس میں "الربوا" کی تشریح کی گئی ہو تاہم ایک ہی مطلب کی دو احادیث مروی ہیں:

کل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربوا۔ (بیہقی) اور کل قرض جر به نفعاً فهو ربوا۔ (مسند حارث بن اسامہ)

یعنی ہر وہ قرض جس سے نفع اٹھایا جائے "ربوا" ہے لیکن ان کے اسناد ساقط[۱] ہیں۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ یہ احادیث ثابت نہیں۔ نیز ان میں نفع کا بطور شرط معلّمہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا اور بغیر شرط کے نفع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ادا فرمایا ہے۔ جیسا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

(۸) امام مالکؒ نے موطا میں زمانۂ جاہلیت کے ربوا کی یہ شکل بتائی ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو کسی مدّت متعینہ پر کچھ قرض دیتا اور جب مدّت ختم ہو چکتی تو قرض دہندہ قرض دار کو یوں کہتا کہ یا تو قرض ادا کر دو یا اس کی مقدار میں زیادتی کر دو۔ طبری[۲]، خازن[۳]، بیہقی[۴]، سیوطی[۵]، خضری[۶]، سب جاہلیت کے "ربوا" کی کم و بیش یہ ہی شکل بتاتے ہیں۔ مولانا مودودی صاحب[۷] لکھتے ہیں: "زمانۂ جاہلیت میں "الربوا" کا اطلاق جس طرز معاملہ پر ہوتا تھا۔ اس کی متعدد صورتیں روایات میں آئی ہیں۔ قتادہ کہتے ہیں۔ جاہلیت کا "ربوا" یہ تھا کہ ایک شخص ایک شخص کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لئے ایک وقت مقررہ تک مہلت دیتا۔ اگر وہ مدت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا۔ مجاہد کہتے ہیں۔ جاہلیت کا "ربوا" یہ تھا کہ ایک شخص کسی سے قرض لیتا اور کہتا اگر تو مجھے اتنی مہلت دے تو اتنا زیادہ دونگا۔ ابوبکر حصاص کی تحقیق یہ ہے کہ اہل جاہلیت جب ایک دوسرے سے قرض لیتا تو باہم یہ طے ہو جاتا کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل راس المال سے زیادہ ادا کی جائے گی۔ امام رازی کی تحقیق میں اہل جاہلیت کا یہ دستور تھا کہ وہ ایک شخص کو ایک معیّن مدت کے لئے روپیہ دیتے۔ اس سے ماہ بماہ ایک مقررہ رقم سود کے طور پر وصول کرتے رہتے۔ جب وہ مدت ختم ہو جاتی تو مدیون سے راس المال کا مطالبہ کیا جاتا۔ اگر وہ ادا نہ کر سکتا تو پھر ایک مزید مدت کے لئے مہلت دی جاتی اور سود میں اضافہ کر دیا جاتا۔ کاروبار کی یہ صورتیں عرب میں رائج تھیں۔ انہی کو اہل عرب اپنی زبان میں "الربوا" کہتے تھے۔ اور یہی وہ چیز تھی جس کی تحریم

---

[۱] سبل السلام شرح بلوغ المرام۔ لان فی اسنادہ سوار بن مصعب الهمدانی المؤذن الاعمی وهو متروك وله شاهد ضعیف عن فضالة بن عبید عنه البیهقی) [۲] جامع البیان جلد چہارم صفحہ ۵ [۳] تفسیر جلد اوّل صفحہ ۲۰۳ [۴] السنن الکبری الجزء الخامس ابواب الربوا۔ [۵] الدر المنثور جزو اوّل صفحہ ۳۶۵ [۶] تاریخ التشریع مصر [۷] سود۔ حصہ اول صفحہ ۳۵۔

کا حکم قرآن مجید میں نازل ہؤا۔

(۹) یہ ظاہر ہے کہ احادیث صحیحہ اور دیگر متعدد روایات کے مطابق عرب جاہلیت میں "ربوا" کی جو صورت رائج تھی وہ وہ تھی جو امام مالکؒ نے بتائی ہے۔ جس کے متعلق قابل ذکر بات یہ ہے کہ "ربوا" کا تعین اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ مقروض رقم معلوم دینے سے عاری ہو چکا ہوتا تھا اور اس کی اس حالت اضطرار سے قرض دینے والا بے جا فائدہ اٹھا کر اپنی من مانی شرائط منوا سکتا تھا۔ یہ سود کی ایک خاص صورت تھی جو شائد عرب ہی میں رائج تھی۔ اور جس کے تحت مقروض کی حیثیت از حد کمزور ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ حضرات مجاہد اور ابوبکر جصاص نے ایک دوسری صورت بتائی ہے۔ جس میں مدت قرض اور شرح سود دونوں کا فیصلہ معاملہ کے شروع میں ہی ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آج کل ہوتا ہے۔ تیسری صورت وہ ہے جس کا ذکر امام رازی نے فرمایا ہے۔ اگر دوسری اور تیسری صورتیں عام طور پر رائج ہوتیں تو غالب ہے کہ دوسرے اصحاب بھی ان کا ذکر کرتے۔ اس لئے گمان ہے کہ یا تو ان کا استعمال بہت کم ہوتا تھا۔ یا وہ ملک کے کسی خاص حصہ میں رائج تھیں اور ان کا علم عرب میں عام نہ تھا۔ لیکن ہمارے نقطۂ نگاہ سے جو چیز خاص طور پر قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ خرید و فروخت سے متعلق جو مثال ملتی ہے وہ وہ ہے جو حضرت قتادہ نے بیان فرمائی ہے اور اس کا تعلق سود کی اس خاص صورت سے ہے۔ جس میں مقروض کی حیثیت بے حد کمزور ہوتی ہے۔ اور اس پر ظلم ہو سکتا ہے۔

(۱۰) باوجود کافی کوشش کے میں یہ معلوم نہیں کر سکا کہ عرب جاہلیت میں "ربوا" کے اصطلاحی معنے کیا تھے۔ لیکن ان مثالوں سے جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ہمارے علمائے کرام نے یہ استنباط کیا ہے کہ راس المال پر جو زائد رقم مدت کے مقابلہ میں شرط اور تعین کے ساتھ لی جائے۔ وہ "ربوا" ہے۔ لیکن اگر اس وقت کے ان معاملات میں جن پر "ربوا" کا اطلاق ہوتا تھا کوئی اور چیز مشترک بھی تھا۔ تو اس کو بھی عیاں کر دینا چاہئے تھا۔ مثلاً اگر یہ سود ان معاملات تک محدود تھا جن میں قرض کو نفع آور کاموں میں نہیں لگایا جاتا تھا تو یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہئے تھی۔ ورنہ اس کے بغیر "ربوا" کی تعریف نامکمل رہ جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے۔ کہ گھوڑے کی ایک دُم، چار ٹانگیں، چار سُم، دو آنکھیں اور دو کان

لہ مولانا ظفر احمد صاحب رسالہ "کشف الدجیٰ عن وجہ الربوا" میں لکھتے ہیں "ہم کو مستفتی پر حیرت ہے کہ وہ قتادہ اور سعید بن جبیر اور امام شافعی اور ابن العربی اور واحدی وغیرہ مفسرین کی تفسیر سے بلا وجہ خوش ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کی تفسیروں میں اس کے لئے خوشی کا کوئی موقعہ نہیں ——— کیونکہ یہ حضرات بلکہ وہ تمام علماء جنہوں نے ربوا جاہلی کی تفسیر میں افظ بیع کا ذکر کیا ہے اس امر پر متفق ہیں کہ اہل عرب بیع کے بعد جب مدت مقررہ پوری ہو جاتی اس وقت کہتے تھے کہ تم رقم دو گے یا سود دو گے۔ اس پر اگر وہ رقم ادا نہ کرتا تو ثمن میں زیادتی کر دیتے اور خریدار کو مہلت دے دیتے۔

علہ مولانا مودودی صاحب۔ سود حصہ اوّل صفحہ ۳۷۔

ہوتے ہیں۔ اس لئے جن مولیشیوں میں یہ صفات موجود ہوں وہ گھوڑے ہیں۔ آپ فوراً کہہ دیں گے کہ یہ غلط ہے کیونکہ گھوڑے کی سب ضروری صفات بیان نہیں ہوئیں۔

(۱۱) "ربوا" کی جو صورتیں اور بیان کی گئی ہیں۔ اُن سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جاہلیت کے عربوں میں تجارتی (PRODUCTIVE) سود کا رواج تھا۔ یعنی لوگ سود پر قرض لے کر نفع آور کاموں کے لئے سرمایہ جمع کرتے تھے۔ اسی طرح گورنمنٹ اور امداد باہمی کی قسم کے قرضوں کا پتہ نہیں چلتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے قرض حاجت مندانہ اور صرفی (EMERGENT AND CONSUMPTIONAL) قسم کے ہی ہوتے تھے۔ ایک ایسے محترم بزرگ سے جن کی تحقیق اس معاملہ میں مسلم ہے اور جو تجارتی سود کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں۔ راقم نے درخواست کی تھی کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں میں تجارتی سود کے رواج کے متعلق اگر ان کے پاس کوئی اطلاع موجود ہو تو اس سے مستفیض فرمائیں۔ جواباً انہوں نے لکھا ہے "کہ یہ بات کسی کتاب میں صراحت سے تو نہیں لکھی گئی کہ عرب جاہلیت میں تجارتی سود رائج تھا۔ لیکن اس امر کا ذکر ضرور ملتا ہے کہ مدینہ کے زراعت پیشہ لوگ یہودی سرمایہ داروں سے سود پر قرض لیا کرتے تھے۔ اور خود یہودیوں میں باہم بھی سودی لین دین ہوتا تھا۔ نیز قریش کے لوگ جو زیادہ تر تجارت پیشہ تھے باہم سود پر قرض لیتے دیتے تھے۔ قرض کی ضرورت لازماً نادار آدمیوں ہی کو اپنی ذاتی ضروریات پوری کرنے کے لئے پیش نہیں آتی۔ بلکہ زراعت پیشہ افراد کو زرعی کاموں کے لئے اور سوداگروں کو اپنے کاروبار کے لئے بھی پیش آتی ہے۔ اور یہ آج کوئی نئی صورت نہیں ہے بلکہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔"

(۱۲) میں باادب عرض کروں گا کہ اس وقت کے زراعت پیشہ لوگوں کے قرض "تجارتی" (PRODUCTIVE) قرض تصور نہ ہونے چاہئیں۔ اس قسم کے قرض نادار اور حاجت مند لوگ لیا کرتے تھے۔ ان کے قرض مجبوری کے قرض شمار کرتے تھے۔ اور ضروریات زندگی پوری کرنے کی غرض سے لئے جاتے تھے۔ جیسا کہ ہمارے اپنے ملک میں رواج تھا۔ ایسے قرضوں کو ماہران معاشیات بھی نفع آور نہیں سمجھتے وہ لکھتے ہیں "حاجت مندانہ یا صرفی قرض کی طرح زرعی قرض بھی غصب وظلم کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ انہی برائیوں کے برخلاف عہد نامہ قدیم کے نبیوں اور یونانی فلاسفروں نے اپنی آوازیں اٹھائیں اور رومی قانون سازوں نے کوشش کی کہ کم از کم شرح سود کی حد ہی مقرر ہو جائے۔"

(۱۳) یہودیوں کے باہم لین دین سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے قرض نفع آور کاموں کے لئے ہوتے تھے۔ عرب کے یہود اکثر زراعت پیشہ تھے۔ اور ایسے لوگوں کے قرض تجارتی قرض نہیں کہلا سکتے۔ ممکن ہے یہ لوگ ساہوکارہ بھی کرتے ہوں لیکن مواقع کے فقدان کی وجہ سے یورپ کے اکثر حصہ کی طرح یہاں بھی ان کے قرض غریب اور امیر دونوں قسم کے حاجت مندوں کو ان کی نجی ضروریات کے لئے دئے جاتے ہونگے۔ بہرحال ان کے ہاں بھی تجارتی سود کی کوئی

مثال منقول نہیں۔

(۱۴) باقی رہے قریش کے باہم قرضے، ان کی جو مثالیں ملتی ہیں ان میں تجارتی قرض کی کوئی مثال شامل نہیں۔ ان دنوں تجارت نجی سرمایہ یا شراکت یا مضاربت سے ہوتی تھی۔ عرب تاجر بیشک دور دراز ملکوں تک جاتے تھے اور بڑے بڑے جتھے باندھ کر سفر کرتے تھے۔ قرآن مجید میں بھی رحلۃ الشتاء والصیف کا ذکر آیا ہے۔ مگر یہ اجتماعی شکل صرف راستہ کے خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے تھی ورنہ سرمایہ اور سامانِ تجارت مہیا کرنے میں ہر شخص اپنی ذات کا ذمہ دار تھا جب مکہ سے قافلہ چلتا تو سب حصہ دار اپنا اپنا مال لے آتے جسے دوسرے علاقہ میں لے جا کر فروخت کر دیا جاتا اور اس کے بدلے وہاں سے چیزیں خرید کر واپسی پر راستہ میں یا مکہ پہنچ کر فروخت کر دی جاتیں اور اس طرح جو منافع ہوتا وہ شریک کا ربانٹ لیتے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تجارت کے لئے سود پر سرمایہ اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عباس بن مطلب رضی اللہ عنہما دونوں قریش میں سے تھے اور روپیہ سود پر دیا کرتے تھے۔ لیکن کن کو؟ کھجور کی کاشت کرنے والوں کو۔ منقول ہے کہ جب کھجوریں اکٹھی کرنے کا وقت آتا تھا تو کاشتکار عرض کرتا تھا کہ قرض خواہ فصل میں سے صرف نصف لینا منظور کرے اور باقی نصف مقروض اور اس کے بال بچوں کے لئے چھوڑ دے تو مقروض آئندہ سال دُگنی مقدار کھجوروں کی ادا کرے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قریش کے قرض بھی زرعی اور حاجت مندانہ قسم کے ہی تھے اور تجارتی نہ تھے۔

(۱۵) آج کل کے زمانہ میں ہم تجارتی قرض سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ ہمارے ذہنوں میں یہ آ ہی نہیں سکتا کہ کسی وقت دنیا کا کوئی حصہ ایسے قرضوں سے خالی رہا ہو۔ لیکن یہ تاریخی امر ہے کہ یورپ کے بیشتر حصہ میں پانچویں اور دسویں صدی عیسوی کے درمیان تجارتی سود موجود نہ تھا۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب نے لارنس ڈینس سے نقل کیا ہے۔ "یہ جو عام خیال ہے کہ قرض شروع میں تجارت کی امداد کے لئے ترقی پذیر ہوا تھا غلط ہے دینیشین، ڈچ، ہنز ٹیک، برٹش اور دوسرے تاجر سترھویں صدی تک روپیہ دینے والوں کو اپنا شریک بنا کر سرمایہ حاصل کرتے تھے۔" ایشلے لکھتا ہے۔ "آج کل کے مستند نقاد اس سے انکار نہیں کرتے کہ ازمنہ وسطےٰ میں ایک ایسا دور آیا جس میں دولت کو منفعت بخش کاموں میں لگانے کے مواقع کی اس قدر کمی تھی کہ سود لینے کے برخلاف جو سخت رجحان تھا وہ جائز تھا۔ ان نقادوں میں اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف اس امر میں ہے کہ یہ دور

14- Islam and the Theory of Interest P 197.

15- An Introduction to English Economic History and Theory, Part 1, Middle Ages by Ashley.

کب ختم ہوا"

(۱۶) مندرجہ بالا حقائق سے ظاہر ہے کہ (ا) کئی ملکوں میں پانچویں اور دسویں صدی عیسوی کے درمیان (جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا زمانہ شامل ہے) تجارتی سود مفقود تھا اور (اا) عرب کے طریقہ تجارت کے پیش نظر ممکن ہے کہ اس ملک میں اس وقت تک تجارتی سود کا رواج ہی نہ ہوا ہو۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارے مورخوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے حالات کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے باوجود اس کے جب انہوں نے تجارتی سود کا ذکر نہیں کیا اور سودی معاملات کے تذکرہ میں اس کی ایک مثال بھی نہیں دی تو گمان غالب یہی ہونا چاہئے۔ کہ اس کا وجود ان دنوں میں نہیں تھا۔ اگر یہ درست ہے کہ عرب جاہلیت میں نفع آور کاموں کے لئے سود پر قرض نہیں لئے جاتے تھے اور "ربوا" کا اطلاق سود کی جن صورتوں پر ہوتا تھا ان کا تعلق حاجت مندانہ یا صرفی قرضوں سے ہی ہوتا تھا۔ تو پیراگراف (۱۰) میں "ربوا" کی جو تعریف بیان کی گئی ہے اس کو بدلنا پڑے گا۔

(۱۷) اب تک یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔ کہ جاہلیت کے عرب نفع آور کاموں کے لئے بھی سود پر قرض لیتے تھے۔ اس لئے جس بڑھوتری کو وہ "الربوا" کہتے تھے۔ اس کا تعلق حاجت مندانہ اور صرفی قرضوں تک ہی محدود ہوگا اور اب بھی اسی طرح محدود رہنا چاہئے۔ اب اس نظریہ کی تائید میں چند عقلی دلائل پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ حدیثوں کی تدوین کے متعلق محدثین نے درایت کے اصول منضبط کئے ہیں۔ ابن جوزیؒ لکھتے ہیں کہ وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہو، قابل اعتبار نہیں۔ قرآن کریم نے جس قدر سزا سود کے کھانے والے کے لئے رکھی ہے وہ شاید کسی اور مجرم کے لئے تجویز نہیں فرمائی۔ اس سے جرم کی اہمیت اور گھناؤنے پن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کسی صاحب عقل کو اس سے انکار نہ ہوگا کہ ایک حاجت مند سے جس کو ضروریات زندگی کے لئے قرض کی ضرورت پڑتی ہے سود لینا شقاوت قلبی ہے۔ اور اس کی مناہی سختی سے ہونی چاہئے۔ لیکن تجارتی سود پر یہ الزام وارد نہیں ہوتا۔ اس کے لینے والے مفلس و نادار نہیں ہوتے۔ وہ قرض نفع کمانے کی غرض سے لیتے ہیں اور عام طور پر نفع شرح سود سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے سود پر دو اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی آمدنی محنت کو چھوڑنے اور آرام طلب ہونے کی ترغیب دیتی ہے۔ لیکن یہ اعتراض ان لوگوں پر بھی عائد ہونا چاہئے جن کے پاس بڑی زمینداری ہے یا بہت سے مکان ہیں یا کمپنیوں کے بے شمار حصے ہیں اور وہ ان کی آمدنی پر بن محنت گزر اوقات ہی نہیں بلکہ عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر اسلام ان نکھٹوؤں کی

لہ فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۱۱۴ و سیرۃ النبی جلد اوّل از علامہ شبلی نعمانی صفحہ ۳۹۔

آمدنی کو حرام قرار نہیں دیتا تو تجارتی سود لینے والا ہی کیوں مورد عتاب ہو؟ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ سود دے کر تجارت کرنے والے کو چاہے نقصان ہو۔ مگر سود لینے والے کو منافع ہی ملے گا۔ یہ اعتراض کسی حد تک درست ہے۔ (قرض لینے والا اگر دیوالیہ ہو جائے تو ممکن ہے قرض دینے والے کو اپنا راس المال بھی پورا واپس نہ ملے) مگر اس بات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے کہ تجارت کے لئے روپیہ سود پر اس لئے لیا جاتا ہے کہ قرض لینے والے کو شرح سود سے کئی گنا زیادہ نفع کی امید ہوتی ہے اور اکثر یہ پوری ہو جاتی ہے، ورنہ تجارتی سود کو اس قدر فروغ حاصل نہ ہو۔ ایسے قرض دینے والے کو ایک چھوٹی رقم مقررہ اوقات پر ملتی رہتی ہے۔ اور اس کے مقابل قرض لینے والا اکثر اس رقم سے کئی گنا زیادہ فائدہ کما لیتا ہے اور کبھی اس کو نقصان بھی ہوتا ہے اس قسم کے خطرے کو قبول کرنا تجارت کا عام مسلک ہے۔ اور یہ ایسی چیز نہیں اور اس سے ایسی خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں کہ فاذنوا بحرب من اللہ و رسول اللہ کی سزا کا مستحق ہو۔ اس لئے میرے خیال ناقص میں سب ایسی احادیث اور روایات کا جو تجارتی سود کو "ربوا" کے تحت لا دیں سختی سے تجزیہ ہونا چاہیئے۔ اور ان کو ہمیں اس کے بغیر مان نہیں لینا چاہیئے۔

(۱۸) اسلام کو ہمیشہ سے اس بات پر بجا فخر رہا ہے کہ اس کے احکام عقل کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں سید سلیمان ندوی صاحب فرماتے ہیں۔ "خدا کا وجود، توحید، رسالت، قیامت، جزا و سزا، عبادت، نماز، روزہ زکوٰۃ، حج، اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں۔"[1] تحریم "ربوا" کا تعلق تو عبادات سے بھی نہیں بلکہ معاشی معاملات سے ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے متعلق احکام کی تعبیر کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ہی چند اصول بیان فرمائے ہیں مثلاً فرمایا ہے :-

" یسئلونک عن الخمر والمیسر، قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس و اثمھما اکبر من نفعھما "

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے۔ "اے پیغمبر تم سے لوگ شراب اور جوئے کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو۔ ان دونوں چیزوں میں نقصان بہت ہے اور انسان کے لئے فائدے بھی ہیں۔ لیکن ان کا نقصان ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے (پس ان سے احتراز کرو)"

اس کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں۔ "عام طور پر سمجھا جاتا ہے (اور اب تک سمجھا جاتا ہے) کہ شراب سے لڑائی لڑنے میں مدد ملتی ہے۔ اور جوا حصول مال کا ذریعہ ہے۔ اس غلطی کا ازالہ کر دیا گیا اور یہ اصولی حقیقت بتلا دی گئی کہ صرف اشیاء کا نفع ہی نہیں دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ اضافی نفع سے تو کوئی چیز بھی خالی نہیں۔ بلکہ نفع اور نقصان

---

[1] سیرۃ النبی جلد چہارم صفحہ ۲۵۹۔

دونوں کا توازن کرنا چاہئے جس چیز میں نقصان زیادہ ہو اسے ترک کر دینا چاہئے۔ اگرچہ تھوڑا بہت نفع بھی ہو اور جس چیز میں نفع زیادہ ہو اسے اختیار کرنا چاہئے۔ اگرچہ نقصان کا بھی احتمال ہو۔"

مولانا مودودی صاحب نے حسب ذیل ترجمہ کیا ہے :-

"پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے ؟ کہو ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے اگرچہ ان میں لوگوں کے لئے کچھ منافع بھی ہیں۔ مگر ان کا نقصان ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔" مولانا موصوف رسالہ دینیات کے صفحہ ۱۲۱ پر فرماتے ہیں۔ پھر جن کاموں میں ایک پہلو فائدہ کا اور دوسرا نقصان کا ہو ان میں شریعت کا اصول یہ ہے کہ بڑے فائدے کے لئے چھوٹے نقصان کو قبول کیا جائے اور بڑے نقصان سے بچنے کے لئے چھوٹے فائدہ کو چھوڑ دیا جائے۔" اس اصول کے ماتحت تجارتی سود کو پرکھئے۔ اس کا نفع اس کے نقصان سے بدرجہا زیادہ ہے۔ پھر ایسے سود کے لینے والوں کو کیوں "اصحاب النار" سمجھا جائے۔ اور ان سے "حرب من اللہ ورسولہ" کی ضرورت کیوں ہو ؟ مضطر اور کمزور حاجت مند کو قرض دینے والے کو شائد اپنا فائدہ اسی میں دکھائی دے۔ کہ مقروض ادا کرنے کے قابل نہ رہے اور وہ اس کی جائداد پر قبضہ کرلے۔ کیونکہ بے کس پر وار کرنا آسان ہے۔ لیکن بنک جب کمپنیوں اور تاجروں کو قرض دیتے ہیں۔ تو وہ ان کی پامالی کے منتظر نہیں رہتے۔ بلکہ ان کی خوش حالی چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی اپنی ترقی اسی سے وابستہ ہوتی ہے۔

میں یا ادب عرض کروں گا کہ یہ امر قابلِ غور ہے کہ مندرجہ بالا قرآنی اصول کے ہوتے ہوئے ہم اس میں کہاں تک حق بجانب ہیں کہ تجارتی (PRODUCTIVE) سود کو بھی احکام تحریم "ربوا" کے تحت لے آئیں۔

بعض اصحاب نے آیت متذکرہ بالا میں "اثم" کا ترجمہ نقصان کرنے پر اعتراض کیا ہے۔ میں نے مولانا مودودی صاحب سے اس کی بابت استفسار کیا تو آپ نے فرمایا "میں نے اثم کا ترجمہ نفع کے تقابل کی وجہ سے گناہ کی بجائے نقصان کیا ہے۔ ویسے یہ زبان کے اعتبار سے غلط بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اثم کے اصل معنی خیر مطلوب کو پہنچنے میں قاصرہ جانے کے ہیں۔ اسی معنی کے لحاظ سے عرب کہتے ہیں "اثمت الناقۃ" یعنی اونٹنی سست رفتار ہے۔ جو تیز رفتاری اس سے مطلوب ہے اس میں کوتاہی برتتی ہے۔"

(۱۹) ربوا الفضل کے متعلق جو احادیث ہیں ان سے بعض علمائے کرام تجارتی سود کی حرمت پر استدلال کرتے ہیں۔ اس لئے اب آپ کی توجہ ان کی طرف مبذول کروائی جاتی ہے۔ ربوا الفضل اس زیادتی کو کہتے ہیں۔ جو ایک ہی جنس کی چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو۔ متعدد احادیث کی بناء پر فقہاء نے فیصلہ کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ پیشتر عرض کیا جا چکا ہے کہ تحریم "ربوا" کی آیت آخری آیات قرآنی میں سے ہے۔ یہ نویں ہجری میں نازل ہوئی اور ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس کا اعلان فرمایا۔ ربوا الفضل کے احکام اس سے پہلے کے ہیں۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں" سنہ ۲ ہجری میں
جنگِ اُحد کے بعد پہلا قدم شرح سود کی تخفیف کی صورت میں اُٹھایا گیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلّہ اور
اجناس کے کاروبار میں سٹّہ (SPECULATION) کو روکا اور ایک ہی جنس کی چیزوں کے مبادلہ میں کمی اور
بیشی کو سود قرار دیا۔ اس کے بعد آپ نے صرافہ (EXCHANGE) کی طرف توجہ فرمائی اور سونے چاندی بصورتِ
جنس (BULLION) یا بصورتِ زر (MONEY) دونوں کے مبادلہ میں ناجائز نفع بازی
کا دروازہ بند کر دیا۔ آخری ضرب اور فیصلہ کُن ضرب فتح مکّہ کے بعد لگائی گئی" سید سلیمان صاحب
ندوی فرماتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ نے چاندی اور سونے کے اُدھار خرید و فروخت کو سود قرار دیا۔ پھر دوگنے اور
چوگنے سود لینے کی ممانعت آئی۔۔۔ اس کے بعد آپ نے ہم جنس اشیاء کا باہم گھٹ بڑھ کے مبادلے سے منع فرمایا سنہ
میں غزوہ خیبر کے موقع پر مسلمانوں نے یہودی سوداگروں سے لین دین شروع کیا۔ اس وقت آپ نے اعلان فرمایا، کہ
سونے کو اشرفی کے بھاؤ گھٹا بڑھا کے بیچنا سود ہے" ان تشریحات سے ظاہر ہے کہ ربوا الفضل کے احکام سورہ
بقرہ کی آیات تحریم "ربوا" کے نزول سے پہلے کے ہیں۔ اس لئے اس وقت کسی قسم کی بڑھوتری کو "ربوا" کہنے سے اسکی
ممانعت مقصود نہیں ہوسکتی تھی۔ اس وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بڑھوتری اور مبادلہ
کے متعلق شاید لفظ "ربوا" استعمال نہ فرمایا ہو تب بھی اغلب تو یہی ہے کہ اس سے مراد اصطلاحی "ربوا" جو بعد کو حرام قرار
دیا گیا نہ ہوگا۔ بلکہ جیسا سر سید احمد خان صاحب نے لکھا ہے" "ربوا" کا لفظ بیع فاسد کے معنی میں استعمال کیا گیا
ہوگا۔

(۲۰) ربوا الفضل کے موضوع پر جو متعدد احادیث موجود ہیں ان میں سے چند یہاں نقل کی جاتی ہیں:

(ا) عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذھب بالذھب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل یداً بید فمن زاد او استزاد فقد اربیٰ، الاخذ والمعطی فیہ سواء
(البخاری واحمد ومسلم)

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سونے کا مبادلہ سونے سے، چاندی کا چاندی سے، گیہوں کا گیہوں سے جَو کا جَو سے، کھجور کا کھجور سے، نمک کا نمک سے جیسے کا تیسا اور دست بدست ہونا چاہیئے۔ جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا اس نے سودی معاملہ کیا، لینے والا اور دینے والا دونوں گناہ میں برابر ہیں۔

(ب) عن ابی سعید و ابی ھریرة ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعمل رجلاً علی خیبر، فجاءہ بتمر جنیب فقال اکلُّ تمر خیبر ھکذا

ابو سعید اور ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر کا تحصیلدار مقرر کرکے بھیجا وہ وہاں سے (مالگذاری میں) عمدہ قسم کی کھجوریں لے کر آیا۔ آں حضرت صلعم

قال لا واللہ یارسول انا لنا خذ الصاع من هذا بصاعین والصاعین بالثلاث فقال لا تفعل بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنیبا وقال فی المیزان مثل ذلک۔

(البخاری ومسلم)

نے پوچھا کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ اس نے کہا نہیں یارسول ہم جو ملی جلی کھجوریں وصول کرتے ہیں انہیں کبھی دو صاع کے بدلے ایک صاع کے حساب سے اور کبھی تین صاع کے بدلے دو صاع حساب سے ان اچھی کھجوروں سے بدل لیتے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو۔ پہلے ان مخلوط کھجوروں کو درہموں کے عوض فروخت کر دو۔ پھر اچھی قسم کی کھجوریں درہموں کے عوض خرید لو۔ یہی بات آپ نے وزن کے حساب سے مبادلہ کرنے کی صورت میں بھی ارشاد فرمائی۔

(ج) عن ابی سعید ن الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تبیعوا الذهب بالذهب الا مثلاً بمثل ولا تشفوا بعضها علیٰ بعض ولا تبیعوا الورق بالورق الا مثلا بمثل ولا تشفوا بعضها علیٰ بعض ولا تبیعوا منها غائبا بناجز۔

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سونے کو سونے کے عوض نہ بیچو مگر جوں کا توں۔ کوئی کسی کو زیادہ نہ دے۔ اور چاندی کو چاندی کے عوض نہ بیچو۔ مگر جوں کا توں۔ کوئی کسی کو زیادہ نہ دے۔ اور نہ غائب کا تبادلہ حاضر سے کرو۔

(بخاری ومسلم)

یہ ظاہر ہے کہ ایک ہی جنس کی دو چیزوں کو بدلنے ضرورت صرف اس صورت میں پیش آتی ہے جبکہ اتحاد جنس کے باوجود ان کی نوعیتیں مختلف ہوں۔ مثلاً چاول اور گیہوں کی ایک قسم اور دوسری قسم عمدہ سونا اور گھٹیا سونا یا معدنی نمک اور سمندری نمک وغیرہ۔ ہمارے علماء کرام کا کہنا ہے کہ ہم جنس اشیاء کے کمی بیشی کے ساتھ[1] مبادلہ کرنے سے اس ذہنیت کے پرورش پانے کا اندیشہ ہے جو بالآخر سود خواری اور ناجائز نفع اندوزی تک جا پہنچتی ہے۔ لیکن آپ ذرا غور سے سوچیں کہ اگر ایک ہی جنس کی اعلیٰ اور ادنیٰ قسم برابر برابر ہی بدلی جا سکے تو کیا اس کا نتیجہ یہ نہ ہوگا کہ طاقت ور لوگ اپنی ادنیٰ چیز کے بدلے کمزور لوگوں کو اپنی اعلیٰ چیز دینے پر مجبور کرنے کے کوشاں رہیں گے؟ جس سے غصب کی ذہنیت پرورش پائے گی۔ اور یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مولانا مودودی آگے چل کر فرماتے ہیں "اس لئے شریعت نے قاعدہ مقرر کر دیا کہ ہم جنس اشیاء کے مبادلہ کی اگر ضرورت پیش آئے تو لازماً حسب ذیل دو شکلوں میں سے ہی کوئی ایک شکل اختیار کرنی ہوگی۔ ایک یہ کہ ان کے درمیان قدر و قیمت کا جو تھوڑا سا فرق ہو اسے نظر انداز کر کے برابر برابر مبادلہ کر لیا جائے۔ دوسرے

---

[1] مولانا مودودی صاحب۔ سود حصہ اوّل صفحہ ۴۸۔

یہ کہ چیز کا چیز سے براہِ راست مبادلہ کرنے کی بجائے ایک شخص اپنی چیز روپے کے عوض بازار کے بھاؤ بیچ دے اور دوسرے شخص سے اس کی چیز روپے کے عوض بازار کے بھاؤ خرید لے۔" کوئی شخص اپنی بہتر چیز دوسرے کی کمتر مگر ہم جنس چیز سے برابر برابر بدلنے پر خوشی سے رضامند نہیں ہوگا۔ اس لئے اس کو ترغیب ہوگی کہ دوسرا طریقہ اختیار کرے۔ یعنی اپنی چیز کو روپے کے عوض بیچ دے اور اس روپے سے دوسری چیز خرید لے۔ میں یہ رائے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی منشاء تھا۔ جیسا کہ منقولہ بالا احادیث میں سے نمبر (ب) سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ تبادلہ جنسی (BARTER ECONOMY) کی بجائے سکّہ سے خرید و فروخت (MONEY ECONOMY) رواج پا جائے۔ اور ایک مسلّمہ امر ہے کہ دنیا کی معاشی ترقی میں یہ ایک اہم اور ضروری قدم تھا جس کے اُٹھانے کی ترغیب شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہر پسماندہ قوم کو دینا چاہتے تھے۔ اگر یہ نظریہ درست ہے تو "ربوا الفضل" کا آیات تحریم "ربوا" سے کوئی تعلق نہیں۔ اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ رکھنا چاہیئے۔

(۲۱) اگر تاریخ اور احادیث کی بنا پر تجارتی یا نفع آور قرض کے سود کو "ربوا" کے تحت لانے کے لئے کوئی بیّن وجوہ موجود نہیں اور اگر عقلی دلائل کی بناء پر ایسے سود کو "ربوا" کی حدود سے باہر رکھنا چاہیئے۔ تو فقہ کے اس متفقہ فیصلہ پر کہ اگر منفعت کی شرط سے کوئی قرض دیا جائے تو اس کا منافع "ربوا" کہلائے گا۔ نظر ثانی ہونی چاہیئے۔ لیکن اس کے کیا امکان ہیں۔ مولانا مودودی[1] صاحب فرماتے ہیں: "فقہائے کرام نے اس دَور میں احکام شریعت کی جو تعبیر کی تھی۔ وہ معاملات کی ان صورتوں کے لئے تھی۔ جو ان کے گرد و پیش کی دنیا میں پائی جاتی تھیں۔ مگر اب ان میں سے اکثر صورتیں باقی نہیں رہی ہیں۔ اور بہت سی دوسری صورتیں ایسی پیدا ہو گئی ہیں جو اُس وقت موجود نہ تھیں۔ اس لئے بیع و شرا اور مالیات و معاشیات کے متعلق جو قوانین ہماری فقہ کی قدیم کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کی اب حاجت نہیں رہی اور جن قوانین کی اب حاجت ہے۔ وہ ان میں موجود نہیں ہیں۔ پس اختلاف اس امر میں نہیں ہے۔ کہ معاشی اور مالی معاملات کے لئے قانون اسلامی کی تدوین جدید ہونی چاہیئے یا نہیں۔ بلکہ اس امر میں ہے۔ کہ تدوین کس طرز پر ہو۔" جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کو تجارتی سرمایہ اکٹھا کرنے کے لئے سود پر قرض لینے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ یہ حالات اسلام کے تعمیری دَور میں بھی قائم رہے اور ہمارے فقہائے کرام نے جب متذکرہ بالا فیصلہ دیا اس وقت گو بڑے بڑے تاجر موجود تھے تاہم اس دَور کی تجارت کا طریقہ ہی ایسا تھا۔ کہ سرمایہ حاصل کرنے کے لئے سودی قرض کی ضرورت نہ پڑتی تھی اور تجارتی دَوڑ میں دوسری قوموں سے مقابلہ کرنے

---

[1] سود حصّہ اوّل۔ صفحہ ۵۳

کے لئے بڑے بڑے سرمایے ایک جگہ اکٹھا کرنے لازم نہ تھے۔ اس لئے ان کو تجارتی سود کے بارے میں کوئی خاص غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں واسکوڈی گاما نے ہندوستان کا اور کولمبس نے امریکہ کا بحری راستہ دریافت کیا۔ جس سے تجارت کو فروغ ہوا۔ پھر صنعتی بحران کا زمانہ آیا۔ اور بڑی بڑی مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں بننے لگیں۔ جن کے لئے سود پر سرمایہ حاصل کرنا لازم ہوگیا۔ جب یہ بڑے کاروبار کا زمانہ آیا اس سے پہلے ہی ہمارے علماء نے اپنے اوپر اجتہاد کا دروازہ بند کر لیا ہوا تھا۔ اور ان تبدیل شدہ اور نئے حالات کے تحت مسئلہ سود پر آزادانہ طور پر غور وخوض نہیں کیا گیا۔ اور جو کچھ تحقیق بھی کی گئی۔ وہ فقہائے قدیم کے فیصلوں کے زیر اثر ہی کی گئی۔ مولانا مودودی صاحب کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کی وجہ یہ ہی ہے کہ ہماری دینی تعلیم سے قرآن اور سیرت محمدی کا مطالعہ خارج ہوگیا ہے اور اس کی جگہ محض فقہ کی کسی ایک سسٹم کی تعلیم نے لے لی ہے۔ ہماری دینی تعلیم کی جس کمی کی طرف مولانا صاحب نے اشارہ کیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن یہ بھی قابل غور ہے۔ کہ جب سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوا ہے اس وقت سے لے کر آج تک دنیا کے علم میں کس قدر اضافہ ہوگیا ہے۔ مذہبی، تاریخی، تنقیدی معلومات اور سیرۃ نبوی پر ڈھیروں مستند کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور کسی امر کی تحقیق کے لئے پہلے زمانہ میں مواد موجود تھا۔ اس سے آج کل کئی گنا زیادہ مواد موجود ہے۔ نیز رسل ورسائل کی ترقی کی وجہ سے یہ امداد کسی خاص ملک تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ بین الاقوامی پیمانہ پر موجود ہے۔ اس لئے میری ناقص رائے میں اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اور یہ ذمہ داری ہمارے علمائے کرام پر عائد ہوتی ہے کہ وہ آج کل کے تبدیل شدہ حالات کے لئے شریعت کے اصولوں سے نئے احکام نکالیں یا پہلے احکاموں میں مناسب ترمیم فرمائیں۔

(۲۲) صنعتی اور معاشی حالات کی تبدیلی کی وجہ دائن اور مدیون کے تعلقات میں دو طریقوں سے نمایاں فرق آگیا ہے۔ ایک یہ کہ پہلے زمانہ میں پیشہ ور مہاجن حاجتمند یا فضول خرچ لوگوں کو قرض دیتے تھے اور ان کی ناداری و بے وقوفی سے فائدہ اٹھاتے تھے آج کل عامۃ الناس اپنی آمدنی میں سے تھوڑا بہت پس انداز کر کے گورنمنٹ کو یا بڑی بڑی کمپنیوں کو بذات خود یا بنکوں کی معرفت قرض دیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ پہلے زمانہ میں قرض خواہ مقروض کی کمزوری کی وجہ سے اس کے سر چڑھا رہتا تھا۔ لیکن آج کل قرض لینے والے بڑے بڑے تاجر، کمپنیاں، سلطنتیں یا ادارے ہوتے ہیں۔ اور ان پر قرض خواہ کسی طرح سے ظلم نہیں کر سکتا۔ حاجتمندانہ اور صرفی قرضوں کی حدود سے باہر دائن اور مدیون کے تعلقات میں یہ جو فرق آگیا ہے اس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ جو فتاوی اس تغیر سے پہلے کے ہیں۔ اور جن میں اس تبدیلی کو زیر غور نہیں لایا گیا۔ میرے خیال ناقص میں وہ ناطق نہ ہونے چاہئیں۔

(۲۳) آج کل صنعت اور تجارت اس قدر بڑے پیمانہ پر ہوتی ہے کہ اس کے لئے ضروری سرمایہ کا اہتمام

ایک دو بلکہ سو پچاس آدمیوں کے بس کا بھی نہیں اور اس کی صورت جو موجودہ تمدن نے پیدا کی ہیں۔ یہ ہے کہ ملک کے چھوٹے چھوٹے اور بڑے بڑے سرمائے چند مرکزوں پر جمع ہو جاتے ہیں جن کو بنک کہتے ہیں۔ بنک اس جمع شدہ سرمایہ کی بناء پر تاجروں وغیرہ کو جاریہ شرح سود پر قرض دیتے ہیں۔ اس طرح صنعت اور تجارت کے لئے حسب ضرورت بڑے بڑے سرمائے مہیا ہو جاتے ہیں۔ اور بڑے پیمانہ پر اشیاء پیدا کی جاتی ہیں جو سود کا بار برداشت کرنے کے باوجود انفرادی کوششوں سے پیدا کی ہوئی اشیاء کی نسبت سستی پڑتی ہیں اور اپنے مالکوں کو بے شمار نفع بخشتی ہیں۔ جو قوم تجارت کے اس طریقہ کار پر رضامند نہیں ہوتی وہ بڑے پیمانہ پر صنعت اور تجارت کا انتظام نہیں کر سکتی اور معاشی دوڑ میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ جاتی ہے۔ ایسی قوم کی سالمیت ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے اور بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ معاشی لحاظ سے کمزور قوموں کو اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے دوسروں کا اس حد تک دست نگر ہونا پڑتا ہے کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی ان کے معاشی نظام میں دخل حاصل کر کے بالآخر ان پر پوری طرح سے چھا جاتا ہے۔ نیز آلاتِ حرب اس زمانہ میں اس قدر قیمتی ہو گئے ہیں کہ جو قوم معاشی کمزوری میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے دفاع کا مناسب انتظام نہیں کر سکتی۔ اس لئے ہر اسلامی ملک کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اپنے معاشی نظام کو قوی اور قوی تر بنائے۔ اس کے لئے نہ صرف ملکی بلکہ اس سے زیادہ بین الاقوامی تجارت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ فی زمانہ بیرونی تجارت کے لئے سود کے بغیر چارہ نہیں۔ اسلامی ممالک کو اگر آج کل کے بین الاقوامی ماحول میں زندہ رہنا ہے تو انہیں کم از کم تجارتی اور گورنمنٹ کے قرضوں کے سود کے جواز کے امکان کے متعلق مزید سوچ بچار کرنا ہوگا۔ اور پچھلے زمانہ کے فقہاء کی اندھی تقلید کی بجائے موجودہ زمانہ کے تبدیل شدہ حالات کو سامنے رکھ کر اسلامی قانون متعلقہ سود کی دوبارہ تدوین کرنی ہوگی۔

(۲۴) مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ترجمان القرآن میں سورۂ بقر کی آیت "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" کی تفسیر میں فرماتے ہیں "دینِ حق میں اصل آسانی ہے نہ کہ تنگی"۔ مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں "پس یہ قاعدہ اسلام میں مسلّم ہے کہ جہاں مشقت اور ضرر ہو وہاں احکام میں نرمی کر دی جائے"۔ اگر آج کل کے زمانہ میں صنعت و تجارت میں مقابلہ کے لئے اور گورنمنٹ کو اپنی بقا کے لئے قرض لینے کے سوا چارہ نہیں۔ اور اگر اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ عرب جاہلیّت میں اس قسم کے قرض رائج تھے تو کیا ہمیں احکام تحریم ربوا کی تعبیر کرتے وقت اللہ تعالےٰ کی اس عطا کردہ آسانی سے فائدہ نہ اٹھانا چاہئے؟ لیکن ہمارے بزرگانِ کا رویہ اس کے برخلاف ہے۔ ان میں سے اکثر تو یہ مانتے ہیں کہ جو چیز قرآن مجید نے حرام قرار دی ہے وہ وہ ہے جس کو اُس وقت کے عرب "ربوا" کے اصطلاحی نام سے یاد کرتے تھے۔ لیکن باوجود اس کے کہ ان کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ ان دنوں عرب میں نفع آور کاموں کے لئے بھی قرض لیا جاتا تھا۔ تقریباً سب ہر قسم کے قرض پر سود کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ میں یہ گزارش پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جب تک اس کا ثبوت نہ مل جائے کہ ایامِ جاہلیت میں نفع آور کاموں کے لئے بھی سود پر قرض لیا جاتا تھا ہمیں "الربوا" کو حاجت مندانہ اور

صرفی قرضوں تک ہی محدود رکھنا چاہئے اور صرف گمان کی بناء پر سود کی اور صورتوں کو حرام کر لینے کی تنگی میں نہ پھنس جانا چاہئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے سورۂ بقر کی مندرجہ ذیل آیات کا جو ترجمہ "ترجمان القرآن" میں کیا ہے اس سے میری گزارش کو کچھ سہارا سا ملتا دکھائی دیتا ہے:

الذین یاکلون الربوا۔ جو لوگ (حاجت مندوں کی مدد کرنے کی جگہ اُلٹا ان سے) سود لیتے ہیں۔

یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات۔ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے (یعنی سودخواری کو مٹانا چاہتا ہے جس کا مقصد حاجت مند کو برباد کر کے خود فائدہ اُٹھانا ہے اور خیرات کے جذبہ کو بڑھانا چاہتا ہے۔ جس کا مقصد حاجت مند کی حاجت روائی کرنا اور اس سے فائدہ اُٹھانے کی جگہ اس کو فائدہ پہنچانا ہے)

(۲۵) اس نظریہ پر کہ قرآن مجید نے صرف اس سود کو حرام کیا ہے جو اس وقت عرب میں رائج تھا۔ ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ "یہ استدلال اس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک یہ فرض نہ کر لیا جائے کہ انسانی معاملات میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا علم بھی انہی معاملات تک محدود تھا جو نزول قرآن کے دور میں رائج تھے اور انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ آگے کیا کچھ آنے والا ہے۔ نیز یہ کہ اسلام صرف ایک وقت خاص کے معاملات میں رہنمائی دینے والا ہے۔ کوئی ازلی و ابدی رہنما نہیں ہے"۔ میری مؤدبانہ عرض ہے کہ میرے استدلال پر ان مفروضات کا اطلاق نہیں ہوتا۔ میں اللہ تعالیٰ کے علم کی لامحدودیت اور اسلامی احکام کی ابدیت پر ایمان رکھتا ہوں اور اسی وجہ سے میری التجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں میں ہم اپنی طرف سے ایزادی نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے جو بڑھوتری حرام قرار دی تھی وہ وہی تھی جس کو اس وقت کے عرب "ربوا" کہتے تھے۔ اگر عربوں میں یہ نام ان دنوں ایسی بڑھوتری کے لئے ہی استعمال ہوتا تھا۔ جو حاجت مندانہ اور صرفی قرضوں پر لی جاتی تھی تو ہمیں کیا اختیار ہے کہ اس کو اس سے زیادہ وسیع معنے دیں اور ایسے قرضوں کی بڑھوتری کو بھی اس میں شامل کر لیں جن میں حاجتمندانہ اور صرفی قرضوں کی خرابیاں نہیں پائی جاتیں؟ صرف نام سے تو حرمت کا اطلاق نہیں ہو جاتا۔ اگر کسی شربت کو شراب کہہ دیا جائے تو وہ حرام تو نہ ہو جائے گا۔ جب تک اس میں نشہ لانے والی ضرر رساں صفت موجود نہ ہو اسی طرح کسی سود کو جس میں وہ نقائص نہ پائے جاتے ہوں جو حاجتمندانہ[26] اور صرفی قرضوں کے سود میں موجود ہیں "ربوا" نہ کہنا چاہئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع (۱۰ سنہ ہجری) میں جو خطبہ دیا اس میں فرمایا "وربا الجاھلیۃ موضوع" یعنی جاہلیت کا "ربوا" باطل کر دیا گیا۔ یہاں بھی اشارہ جاہلیت کے سود کی طرف ہے نہ کہ دنیا کے ہر قسم کے سود کی طرف۔ محمد ابوالسعود صاحب جو ایک مصری عالم ہیں اور کچھ عرصہ ہوا ہمارے سٹیٹ بنک میں ایڈوائزر کے عہدہ پر فائز تھے۔ لکھتے ہیں کہ حضرات ابن قدامہ اور ابن تیمیہؒ کی رائے میں ربا النسیہ کا اطلاق اسی قسم کے قرضوں پر ہوتا ہے جن کا رواج زمانہ جاہلیت میں تھا۔

26- Islamic Review Feb 1957. Islamic View of Rabaa.

مولانا ظفر احمد صاحب رسالہ کشف الدجیٰ عن وجہ الربوا میں فرماتے ہیں: "طحاویؒ نے بھی اس کی تصریح کی ہے کہ جو "ربوا" جاہلیت میں متعارف تھی قرآن مجید میں اسی ربوا کا ذکر ہے اور طبری نے مجاہد سے اس مضمون کو ان لفظوں سے روایت کیا ہے کہ جس "ربوا" سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کسی کا دوسرے کے ذمے دین ہوتا تو مدیون سے کہتا کہ میں تم کو اتنا زیادہ دوں گا مجھے مہلت دے دو۔ اس پر وہ مہلت دے دیتا۔"

(۲۶) میرے ایک اور محترم دوست نے فرمایا ہے: "غور فرمائیے کہ ہمارے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زاویہ ہائے نظر میں کتنا اختلاف ہے۔ ہم تو اس کوشش میں ہیں کہ "ربوا" کی کوئی بھی نئی صورت ہو تو اسے حلال کر لیں اور حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جس قدر "ربوا" کی شکلیں معلوم ہیں ان کو تو حرام سمجھو ہی گے۔ ان کے علاوہ بھی اگر کسی میں "ربوا" کا شائبہ ہو تو اسے بھی حرام سمجھو۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان دونوں نظریات کی بنا ایک ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے "ربوا" کی تمام شکلوں کو کھول کر بیان نہیں فرمایا۔ کیا ہم اس سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے۔ اللہ اللہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک، ہم گنہ گاروں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تقوے کی امید بے سود ہے۔ لیکن پھر بھی اگر ذرا غور سے دیکھا جائے۔ تو شاید یہ اختلاف مفقود ہو جائے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ "ربوا" کسے کہتے تھے۔ اور اگر اس کا اطلاق صرف ایسے سود پر ہوتا تھا جو حاجت مندانہ یا اضطراری یا صرفی قرضوں پر لیا جاتا تھا تو بلاشبہ "ربیبہ" کی صورت بھی ایسی ہی ہو گی جس میں اس قسم کے سود کی برائیوں اور نقصانات کی جھلک ہو۔ یعنی جس میں کسی کی حاجت مندی اور ناداری سے فائدہ اٹھایا جائے۔

(۲۷) اوپر کی بحث میں جو زاویۂ نظر پیش کیا گیا ہے وہ مجملاً یہ ہے: اوّل "الربوا" سے وہ سود مراد ہے۔ جو حاجتمندانہ اور صرفی قرضوں پر لیا جاتا ہے اور دوئم قرض کی ان قسموں کے علاوہ اور قسمیں بھی ہیں۔ مثلاً وہ جن کا روپیہ نفع آور ( ) کاموں میں لگایا جاتا ہے۔ یا جو گورنمنٹ لیتی ہے۔ ان کے سود پر قرآنی حرمت عائد نہیں ہوتی اور ان کے متعلق قوم کو اختیار ہے کہ اپنی ضروریات کے مطابق لیکن قرآنی اصولوں کے ماتحت فیصلہ کرے۔ اسلام میں اکتنا اور احتکار ممنوع ہے۔ اسے یہ بھی پسند نہیں کہ آدمی نکھٹو بنا رہے اور اپنی روزی کے لئے محنت نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔ کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ۔	جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب الیم کی خبر دیدو۔ تاکہ ایسا نہ ہو مال و دولت صرف دولتمندوں کے گروہ میں ہی محصور ہو کر رہ جائے۔ نہیں ملتا انسان کو مگر جس کے لئے وہ کوشش کرے۔

چنانچہ میری رائے ناقص میں اسلام اصولاً اس چیز کو پسند نہیں کرتا کہ اس کا کوئی پیرو سود یا زمین اور

مکانوں کے کرایہ پر گزر اوقات کرے۔ لیکن یہ منافی حاجتمندانہ اور صرفی سود کے علاوہ حرمت کی حد تک نہیں پہنچتی۔ اور نہ ہی گورنمنٹ پر دیا قوم پر بحیثیت مجموعی) حاوی ہوتی ہے۔ اس لئے اگر نفع آور کاموں کے لئے سود پر سرمایہ اکٹھا کرنا ہو تو اس کا احسن طریقہ یہی ہوگا کہ سلطنت خود اس کا انتظام کرے۔ اور اس کے لئے گورنمنٹ اپنے بنک چلائے لیکن جہاں اور جب تک یہ ممکن نہ ہو افراد کے لئے اس قسم کا سود لینا اور دینا ممنوع نہ ہونا چاہیئے۔ باقی رہا وہ سود جو حاجتمندانہ اور صرفی قرضوں پر لیا جاتا ہے یہ چونکہ حرام ہے اس لئے گورنمنٹ کو ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ ایسے قرض لوگوں کو بغیر سود کے مل جائیں۔ اس کا بہتر طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ امداد باہمی کی سوسائٹیوں یا بنکوں کی معرفت اس کا انتظام کیا جائے اور جہاں ضرورت ہو سلطنت زکوٰۃ وصول کر کے بیت المال سے ان کو سرمایہ مہیا کرے۔ اس سلسلہ میں اس امر کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ حیدر آباد دکن میں تقسیم ملک سے پہلے کم از کم ایک ایسی امداد باہمی کی سوسائٹی[1] موجود تھی جو بغیر سود کے چلائی جاتی تھی۔

(۲۸) "ربوا" کی رائج الوقت تعبیر کے متعلق جو شبہات میرے ذہن میں اُٹھے ان کو آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس مسئلہ کا فیصلہ تو بزرگان دین اور علمائے کرام ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر میں ان کی توجہ اس کی اہمیت کی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو سکوں اور ان کی خدمت میں یہ گزارش پہنچا سکوں کہ آج کل کے تبدیل شدہ معاشی حالات میں اس پر نئے سرے سے آزادانہ بحث کی ضرورت ہے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

(۲۹) جو نظریہ گزشتہ سطور میں آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے اس کی بناء اس پر ہے کہ عرب جاہلیت میں نفع آور کاموں کے لئے سود پر قرض نہ لیا جاتا تھا۔ لیکن مجھے اپنی کم علمی کا پورا احساس ہے۔ میں نے ایمانداری کے ساتھ اس بات کو معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ آیا ان دنوں ایسے قرض رائج تھے۔ لیکن مجھے اس کے ثبوت میں کوئی معتبر روایت نہیں مل سکی۔ اگر کسی صاحب کو کوئی ایسا قابلِ اعتبار حوالہ معلوم ہو جس سے اس مفروضہ کی صحت پر حرف آسکے۔ تو ازراہِ کرم اس سے مطلع فرما کر میری راہنمائی فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔

(۳۰) کئی فاضل بزرگان نے تجارتی سود کی بعض برائیوں کی طرف توجہ دلا کر اس کی حرمت کے حق میں استدلال کیا ہے۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ جو تجارتی چکر (Trade Cycles) آتے ہیں ان کی ذمہ واری سود ہی عائد ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ جب کساد بازاری ہو اگر اس وقت سود کا بار صنعت پر نہ پڑے تو اشیاء سستی بک سکیں گی اور ان کی مانگ زیادہ ہوگی۔ لیکن کوئی ماہر معاشیات آج تک یہ نہیں کہہ سکا کہ اگر سود ممنوع قرار دے دیا جائے، تو اس سے تجارتی چکر بند ہو جائے گا۔ بعض حضرات اس بحث میں پڑ گئے ہیں کہ سود کسی چیز کا عوض ہے۔ ہمیں اس چکر

---

[1] معارف مارچ ۱۹۴۴ء صفحہ ۲۱۱، ۲۱۶ جس کا شیخ محمود احمد صاحب نے اپنی کتاب اکنومکس آف اسلام میں حوالہ دیا ہے۔

میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک ایک صنعت کار مزید سرمایہ حاصل کرکے زیادہ فائدہ کما سکتا ہے۔ وہ اس کی قیمت دینے کو تیار ہوگا۔ اور اسی قیمت کا ایک نام سود ہے۔ بعض اصحاب نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ سود پر قرض کی بجائے اور ذریعوں سے بھی بڑی مقدار میں سرمایہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً شراکت یا مضاربت سے۔ لیکن ماضی کا تجربہ اس کے برخلاف رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات قابلِ غور ہے۔ حالانکہ سود کی مناہی کمیونزم کے بنیادی اصولوں میں سے ہے اور اشتراکی ممالک میں سب نفع آور ذرائع گورنمنٹ کی ملکیت ہوتے ہیں۔ پھر بھی روس کو کسی حد تک سود کی اجازت دینی ہی پڑی۔

اسلام اور مذاہبِ عالم

مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی

مذاہبِ عالم اور اسلام کا ایک تقابلی مطالعہ۔ یہ کتاب یہ وضاحت کرتی ہے کہ اسلام انسان کے مذہبی ارتقاء کی فیصلہ کن منزل تھی۔ اس نے تمام مذاہب کے حقائق کو یکجا کرکے اپنی وحدت میں سمو لیا۔ صفحات ۲۹۸ قیمت -/۴/۸ روپے۔

مآثر لاہور

مصنفہ سید ہاشمی فرید آبادی

یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ تاریخی حالات کے ساتھ قدیم لاہور کے والیوں کا تذکرہ سناتا ہے۔ دوسرا مشائخ، علماء، مصنفین و شعراء لاہور سے اختصاص رکھتا ہے۔ صفحات حصہ ۲۰۸۔ دوم ۱۶۰۔ قیمت -/۶/۸ روپے۔

حیاتِ محمدؐ

مترجمہ ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی

مصر کے یگانہ روزگار انشاء پرداز محمد حسین ہیکل کی ضخیم کتاب کا سلیس ترجمہ۔ معلومات کی فراوانی اور طرزِ تحریر کے اعتبار سے بے مثال کتاب۔ صفحات ۱۲۴۱۔ قیمت ۲۲/۸ روپے

سکرٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور